ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

اردو تنقید اور نو تاریخیت

URDU CRITICISM AND NEW HISTORICISM

Dr. Uzma Noreen
Lecturer Urdu Department G.C Women University Sialkot
Uzma.noreen@gcwus.edu.pk

Abstract

New Historicism in Urdu Literature is an interesting research work. It highlights the events in their true Sense which is not presented by pure historians. Usually, Historians report the incidents, fights and wars as they are directed by their ruler. The prohibited and real picture of the event is presented by the literary Persons in the form of poetry, prose, story, fiction and novels. In order to access the true picture of past events, it is mandatory to go through the literature of that era. In current research paper, it is tried and struggled to invite the attention of researchers that they should consult literature to comprehend the real sense of historical records.

Historicism is a literary term that refers to the idea that literature, regardless of its period, should be viewed in the context of the concepts, formalities, and perspectives of that period. High-quality literature cannot be limited to a particular period. However, every writer and poet creates literature within the specific social atmosphere and intellectual attitudes of his or her period, and this atmosphere or attitudes are reflected to some extent in his or her writings. The purpose of historicism is to make literature from different periods more meaningful to the contemporary reader. The primary task of historicism is to understand and explain the concepts and values through which a civilization maintains its continuity.

Literature is an interesting research work. It highlights the events in their true

Sense which is not presented by pure historians. Usually, Historians report the incidents, fights and wars as they are directed by their ruler. The prohibited and real picture of the event is presented by the literary Persons in the form of poetry, prose, story, fiction and novels.

In order to access the true picture of past events, it is mandatory to go through the literature of that era. In current research paper, it is tried and struggled to invite the attention of researchers that they should consult literature to comprehend the real sense of historical records.

Key words:

Historicism, New Historicism, Literature, History, Poetry, Prose of Urdu, contemporary reader, civilization maintains.

تنقید کسی بھی فن پارتے کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔اس لیے یہ فلسفہ ادب کہلاتا ہئے۔یعنی فن پاروں کو پڑھنے کے بعد جو سب سے پہلا تاثر ابھرتا ہے وہ تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتا ہے۔جیسے میں یہ محسوس کرتا ہوں۔میں نے یہلکھا۔میرے خیال میں ایسا ہے یاویسا ہے۔اس کو تاثراتی نقاد خیال کیا جاتا ہے۔اس کو ہم جنسی، اعصابی خواب کا نام بھی دے سکتے ہیں۔یعنی یہ فوری، لحاتی اور ذاتی پسند ناپسند کے لیے مشہور ہے۔حالاں کہ اس کا تنقید سے کم ہی تعلق ہے،۔وجہ یہ ہے کہ تنقید جذب کی بجائے تعقل کو بروئے کار لاتا ہے۔اس سے تنقید میں فلسفہ در آتا ہے اور وہ اسے فلسفیانہ کار گزار میں بدل دیتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ فلسفہ میں وجوہات کی تلاش ہوتی ہے اس لیے تنقید تخلیق یا فن پارے میں وجوہات اور علتوں کی تلاش کرتی ہے۔اس لیے تنقید کی ترقی یافت مباحچ کا غالب میلان علمی اور تجزیاتی بنیادوں پر ہوتا ہے اور یہی تنقید کی اصل روح ہے۔اس حوالے سے تنقید کے دو پہلو ہیں۔ایک نظری تنقید اور دوسرا اطلاقی تنقید۔

نظری تنقید کو فلسفے کی اجزائے ترکیبی جیسے نظریات، اصولوں اورر سمیات میں جو ادب کی تقسیم میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔یوں نظری تنقید فلسفے، سماجیات، معاشیات اور نفسیات جیسے علوم سے استفادہ کر کے اصول وضوابط بناتی ہے۔یہ تنقید نظریہ ساز بھی ہوتی ہے اور عملی تنقید کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔

تنقید کا دوسرا پہلو "اطلاقی یا عملی تنقید" ہے۔نظری تنقید کے وضع کردہ نظریات اصول اور طریقہ ہائے کار کو جب عملی طور پر فن پارے پر اپلائی کیا جائے اور اس طرح اصول وضوابط عملی شکل میں سامنے آجائیں تو یہ اطلاقی یا عملی تنقید کے زمرے میں آتا ہے۔وگرنہ نظری تنقید محض تصوراتی کھیل کا درجہ اختیار کرے

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

گی۔ گویا وہ خلا میں معلق تصور ہو گی۔ اسی طرح نظری اور اطلاقی تنقید ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور غیر مربوط تصویر ہو گی۔ اس ضمن میں ڈیوڈ ڈائچس کا یہ قول بیان کیا جاتا ہے:

"تنقیدی نظریات اور عملی تنقید میں امتیاز ہے تو بڑی حد تک مصنوعی، لیکن اس میں تفریق بالعموم کارآمد ثابت ہوتی ہے۔"(۱)

ہمارے ہاں عموماً علمی امر کو "درآمد شدہ" کا طعنہ دے کر رد کرنے کا رواج عام ہے، اس لیے ہم کچھ سیکھتے نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ جدید ادبی تھیوری نے اچھے، معتبر اور مربوط میلانات سے ادب کو ثروت مند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مثلاً ساختیات کے نظریے کی اہمیت کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ اس کی افادیت اور عملی طور پر اطلاق میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس تھیوری کے حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیئر لکھتے ہیں:

"جو لوگ تھیوری کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس کے بغیر بہتر طور پر کلام چلا لینے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ کسی پرانی تھیوری کی جکڑ میں رہتے ہیں۔۔۔ کسی قسم کی تھیوری کے بغیر خواہ وہ مبہم اور مضمر ہی کیوں نہ ہو۔ ہم یہ جان نہیں سکتے کہ ایک ادب پارہ ہوتا کیا ہے اور اسے ہم کیسے پڑھیں۔ تھیوری کی عداوت کا عام طور پر مطلب دوسرے لوگوں کی تھیوریوں کی مخالفت اور اپنی تھیوری کی فراموش گاری ہوتا ہے۔ اردو میں تھیوری کی مخالفت اُن لوگوں نے خاص طور پر کی جنھیں اپنی تھیوری پر شدت سے اصرار ہے، مگر اسے وہ تھیوری کا نام نہیں دینا چاہتے۔"(۲)

یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے کہ کیا کوئی علم یا کلامیہ کسی نظریے کی بنیاد نہیں ہوتا؟ وگرنہ نظریہ کی ساری بنیاد گر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیاتی تاریخ، تاثراتی، ہئیتی، سماجی، عمرانی وغیرہ تھیوری کی قدیم اشکال ہیں۔ جب کہ ساختیات، مابعد نو آبادیات، ماحولیات اور نو تاریخیت جدید تھیوری کے ذیل میں آتے ہیں۔

ادبی تھیوری متن کے کام کرتی ہے؟ نیز یہ کہ وہ متن کے مطالعے میں کس چیز کی خواہش مند ہے؟ ان سوالات کے لیے ہمیں نو تاریخیت کے تحت سامنے آنے والی اطلاقی مطالعات کی تعین کرنی ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ نو تاریخیت جدید ادبی تھیوری ہی کی بدولت متصور ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ تھیوری کیا ہے؟ اس تھیوری کی ناقدین نے کئی ایک تعریفیں کی ہیں لیکن قاضی افضال حسین کا خیال حقیقت کے قریب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تھیوری تصورات وہ نظام کلام جو اپنے موضوع کی ماہیت / طرز وجود سے بحث کرتا ہے۔"(۳)

اس حساب سے دیکھا جائے تو تھیوری کا بنیادی مقصد متن کی تشکیل ہے۔ اب متن کا تشکیلی نظام کیسے معلوم ہو۔ تھیوری ادبی یا ثقافتی متن کے متعلق یہ پوچھتی ہے کہ اس کے معنی کیسے تشکیل پائے ہیں اور دوسرا یہ کہ ادبی متن اصل و اصول کیا ہے؟ تیسرا یہ کہ متن، قاری اور مصنف کی منطق میں کیا ربط ہے؟ چوتھا یہ کہ تشکیلی عناصر کیا ہیں؟ پانچواں یہ کہ متنی مواد کی کیا حقیقت ہے اور ان کا آپسی ربط کیا ہے؟

تھیوری ان سارے اوپر کے سوالات اور ادبی و ثقافتی متون کی بالائی اور زیریں سطح کی تہوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہی وصف تھیوری کو دیگر عمومی مطالعات سے الگ کرتا ہے۔ یعنی ثقافتی مظہر یا متن کی تفہیم و تعبیر کو سامنے لاتی ہے۔ اسی طرح اس سے متون، علوم، ثقافتی مظاہر اور سماجی طبقات کی ہم رشتگی پر زور دیا گیا ہے۔ اس طرح مختلف ناقدین نو تاریخی مطالعہ میں بھی یہ مباحث آتے ہیں،

نو تاریخی مطالعے میں دیگر تناظرات میں رد تشکیلیت سے استفادہ کیا۔ جس کا مقصد متن کے اندر معانی کے اسہال اور متحرک ہونے پر ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے اردو ادب میں ابہام گوئی تحریک، جس کا مقصد قریب اور بعید کا فرق غور و حوض کے سمجھ میں آتا ہے۔ ردِ تشکیلیت اس کے خلاف جاتی ہے۔ اور نو تاریخی مطالعے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مصنف نے مطلب کی ترسیل کی ہے۔ وہ اس زمانے کے مقتدر طبقات کے مطابق ہے یا مصنف اس سے انحراف کرتا ہے جیسے اردو کے معروف تاریخی ناول نگار نسیم حجازی کے ناول نو تاریخیت کے حوالے سے خاصے کی چیز ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول "محمد بن قاسم" میں مستند تاریخ بیان کرنے کی بجائے اس سے انحراف کیا ہے اور اس طرح اس تاریخی جائزے کو تہہ و بالا کیا ہے۔ اس طرح ان کے تقریباً تمام تاریخی ناولوں میں یہی نقطہ سرِ فہرست ہے اور وہ نو تاریخیت کے اصولوں پر پورا اترتے ہیں۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیئر مصنف اور قاری کے معنی خیزی کی الگ الگ وضاحت سیاق اور تناظر کے حوالے سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

"پہلا (سیاق) تحریری ہوتا ہے جب کہ دوسرا (تناظر) غیر تحریری ہوتا اور متن سے باہر ہوتا ہے۔یعنی معنی کا وہ عادی عمل ہوتا ہے جس سے ثقافت، تاریخ، شعریات، روایتے وغیرہ سے عبارت ہوتی ہے۔اور جس کی طرف متن میں اشارے اور کوڈ موجود ہوتے ہیں۔"(۴)

مطلب سیاق کو مصنف اور تناظر کو قاری کے ساتھ منتھی کیا جاتا ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ نو تاریخی مطالعے میں قاری مصنف کے سیاق کو تناظر سے دیکھے۔اس عمل میں تجزیہ، تشریح اور تعبیر کا نو تاریخی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں نو تاریخیت کے اطلاقی مباحث کے حوالے سے یہاں ہم کچھ مضامین و مقالات پر روشنی ڈالتے ہیں:

۱۔ بڑے گھر کی بیٹی۔۔۔۔ چھوٹا کردار (شمس لرحمان فاروقی۔۲۰۰۷ء)

۲۔ ردش رنگ چمن۔۔۔۔ نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال (پروفیسر بیگ احساس۔۲۰۱۷ء)

۳۔ صص ہند: تاریخیت اور نو تاریخیت (ڈاکٹر قاضی عابد۔۲۰۱۵ء)

۴۔ س و خاشاک زمانے: نو تاریخی پڑھت (ڈاکٹر نسیم عباس احمر۔(۲۰۱۸ء))

۵۔ بد اللہ حسین کا نو تاریخی شعور تحقیقی مطالعہ "ادار لوگ" (ڈاکٹر حنا جمشید۔۲۰۲۲ء

۶۔ ردو تنقید میں تاریخیت اور نو تاریخیت کے مباحث (سید ازور عباس۔۲۰۱۸ء

۷ زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت (تتلیاں ڈھونڈنے والی اور رقص بسمل کے حوالے سے۔سمیعہ شکور۔۲۰۱۹ء

۸ اسد محمد خان کے افسانوں مین نو تاریخیت (عائشہ واجد۔۲۰۲۰ء

۱) **"بڑے گھر کی بیٹی"** پریم چند کا افسانہ ہے۔اس کو شمس الرحمان فاروقی نے "بڑے گھری بیٹی۔۔۔۔ چھوٹ کردار" میں نو تاریخی تناظر کا موضوع بنایا ہے۔اس طویل مضمون میں فاروقی صاحب نے جدید تنقیدی مباحث کی وشنی میں جدید تھیوری کے حساب سے نو تاریخی تنقید کو پرکھا ہے۔مذکورہ مضمون میں انھوں نے اس افسانے کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس افسانے کا تھیم وہ نہیں جو بظاہر نظر آتا ہے جب کہ قرأت، نظریہ قرأت اور تنقیدی قرأت کے حوالے سے تفصیلی بحث کی ہے۔اس کہانی کا خلاصہ یوں ہے:

"ٹھاکر جو اس افسانے کا فعال کردار ہے۔اس کی بیوی کا نام آنندی ہے۔آنندی ہی مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہئے۔ٹھاکر، آنندی کو ایک بڑے گھر سے بیاہ کر لایا ہے۔آنندی اور اس کے دیور میں ناچاکی ہوتی ہے۔تو آنندی ٹھاکر سے دیور کے غیر مناسب رویے کی شکایت کرتی ہے۔شوہر کئی مرتبہ اس معاملے کو نظر انداز کرتا ہے۔بات بڑھتی جاتی ہے۔اور ایک دن بھابھی اور دیور میں سخت تلخ کلامی تک جا پہنچتی ہے۔اس واقع کے بعد چھوٹا بھائی ٹھاکر کی ناراضی سے بچنے کی گھر چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو آنندی دونوں مین ثالثی کا کردار ادا کر کے صلح کروادیتی ہے۔ٹھاکر کیوں کہ گاؤں کا طاقت ور اور صاحبِ اقتدار ہے اس لیے لوگ ٹوہ میں ہوتے ہیں کہ بات کرنے کا کوئی موقع ہاتھ آئے۔تاہم آنندی اپنی صلاحیت سے اس معاملے کو کالعدم کر دیتی ہے۔یوں پورے گاؤں میں بڑے گھر کی بیٹی کے چرچے ہوتے ہیں کہ وہ بگڑے ہوئے امور کو سنبھال لیتی ہے۔"(۵)

شمس الرحمان فاروقی نے پریم چند کے اس نظریے کو چیلنج کیا ہے کہ عورت اپنے سسرال میں ہمیشہ چھوٹی بن کر رہے۔پریم چند نے اگرچہ اسے بڑا تو بنایا ہے مگر اس نے یہ بات بین السطور میں کہی۔فاروقی صاحب کے خیال میں پریم چند نے آنندی کو چھوٹا بنا کر پیش کیا ہے۔وہ اپنے خیال کو یوں بیان کرتے ہیں:

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

"چھوٹا کردار کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ پریم چند نے اسے (آنندی) چھوٹی طبیعت یا قابلِ اعتراض طینت کا حامل دکھایا ہے۔ "چھوٹا کردار" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کی نظر میں گھر کے اندر عموماً اور سسرال میں یقیناً عورت کا مرتبہ یہی ہے کہ وہ چھوٹی بن کر رہے۔ بڑے گھر کی بیٹی کی برائی اس میں ہے کہ وہ دب کر رہے۔ افسانہ نگار یا اس کا کوئی دوسرا کردار، ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ بڑے گھر کا بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی کہ بتیا ہوئیں۔ تو ایسا کیوں ہے؟ ممکن ہے کہ افسانہ نگار کی نظر میں یہ ایک کائناتی حقیقت ہو کہ بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ انھیں ایسی ہی ہونا چاہیئے۔ جیسی کہ وہ اس افسانے میں نظر آتی ہے۔ یا ممکن ہے افسانہ نگار کیا خیال کچھ اور ہو۔ لیکن اُس نے بڑے گھر کی بیٹی کا متذکرہ بالا روپ یہ سمجھ کر پیش کیا ہو کہ میرے قاری اس روپ کو پسند کریں گے۔"(۶)

یعنی افسانہ نگار آنندی کو روایتی طور پر نیں بلکہ شعوری طور پر اچھا بنا رہے ہیں کیوں کہ عورت کی کامیابی عموماً گھر میں دب کر رہنے میں ہی ہے۔ دیگر یہ کہ آج کا نو آبدیاتی نظام بھی عام انسانوں کو دنا کر رہنے کی تاکید اور درس دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانی نو تاریخیت کے حوالے سے بہترین تجزیاتی مطالعہ پیش کر رہا ہے۔

۲) **پروفیسر احساس بیگ کا مضمون گردش رنگ چمن۔۔۔ نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال** میں بیگ صاحب نے قراۃ العین حیدر کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مصنفہ نے اپنے عہد کے مقتدر اور اتھارٹی سمجھنے والے طبقے کے خلاف اپنی ایک اہم اور منفرد رائے پیش کر کے یہ ناول لکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی ایک آزادنہ رائے رکھتی ہیں۔ بیگ صاحب لکھتے ہیں:

"گردش رنگ چمن" مندرجہ بالا نکات پر پورا اترتا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مصنفہ نے یہ رویہ شعوری طور پر اختیار کیا یا غیر شعوری طور پر اپنایا۔"(۷)

بیگ صاحب نے قرۃ العین حیدر کے تاریخی اور تہذیبی احساس کو مکمل طور پر ماپنے کی سعی کی ہے جیسا کہ ہندوستان میں غدر کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں نے نو آبادیاتی سسٹم کے تحت ہیپناٹائزڈ ہو کر انگریزوں کی غلامی میں دیا۔ اردو ناول میں اس کی مثالیں ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں میں ملتی ہیں۔ برصغیر کے مرد ایسے ناکارہ اور نکھٹو بن گئے کہ الاماں۔ یعنی نو آبادیاتی ہتھکنڈوں کے ذریعے سے ان کے گلے میں غلامی کا طوق پہنایا گیا جو آج تک ہم اپنے گلے میں لیے پھر رہے ہیں ،اس کی مثال آج یہ ہے کہ انگریزی زبان بولنے کو قابلیت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں عموماً اس بات کی نفی کی ہے اور اس تہذیب کے خلاف ردتشکیلیت کے تحت ایک الگ تہذیب رائج کرنے کی سعی کی ہے۔ اب یہ ایک الگ بحث ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب یا ناکام ہیں لیکن انھوں نے نو تاریخی اصولوں کے تحت اپنا ایک الگ تصور پیش کیا ہے اور اپنے ناول "گردش رنگ چمن" میں اس طبقے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا ہے، اس حوالے سے بیگ احساس لکھتے ہیں:

"کیسے کیسے اہلِ کمال اپنے زمانے میں موجود تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ روسا اپنے لڑکوں کو آداب تہذیب سیکھنے اعلیٰ درجے کے بالاخانوں میں بھیجتے ہیں۔ ان کا ایک کردار پوچھتا ہے ایسا کیوں ہے؟ کیوں انگلستان میں لارڈ لوگ اپنی اولاد کو تھیٹر میں ناچنے والیوں کے ہاں تربیت کے لیے بھیجتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری مائیں بہنیں ایسی ایجوکیٹڈ نہیں کہ خود اپنے لڑکوں کی تربیت کر سکیں۔ وہ چندا بائی کے بارے میں لکھتی ہیں جس کو مہ لقا کا لقب دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ایک مجرے کے ایک ہزار لیتی تھی۔ مہاراجہ چند اول کے کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔ آصف جاہ ثانی کے پیچھے پیچھے اپنے ہاتھی پر میدانِ جنگ میں جاتی تھی۔ یکتائے روزگار، نیزہ باز، تیر انداز، شہ سوار، علم دوست اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ جس کا دیوان انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ ماہ لقا لاکھوں روپے چھوڑ کر مریں۔ بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی ماہ لقا چندا بائی کی زمین پر تعمیر ہوئی۔"(۸)

ایک اور جگہ مصنف نو تاریخیت کے اصولوں کے تحت اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

"قرۃ العین حیدر کا ناول فن کا ایسا مایا جال ہے جس میں قاری کھو جاتا ہے۔ اس ناول میں ایک جہاں معنی چھپا ہوا ہے۔ ایک سطر، ایک ایک لفظ معنی کی کئی سطحیں رکھتا ہے۔۔۔ گردش رنگ چمن مندرجہ بالا نکات پر پورا اترتا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مصنف نے یہ رویہ شعوری طور پر اختیار کیا ہے یا غیر شعوری اپنایا ہے۔"(۹)

۳) **ڈاکٹر قاضی عابد کا مضمون "قصص ہند تاریخیت اور نو تاریخیت"** میں محمد حسین آزاد کی قصص ہند کو موضوع بنایا ہے۔ تاریخ اور تاریخیت کو کو گزرا ہوا زمانہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

مضمون ہذا میں قاضی عابد نے محمد حسین آزاد کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ آزاد نے محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، اکبر اعظم، شیواجی، محمد شاہ اور نسائی کرداروں میں "پدمنی، دیول دیوی اور نور جہاں" اور محمد حسین آزاد نے پاکستانی ہیروز کے تصور کے مطابق پیش نہیں کیا اور یہی نو تاریخیت ہے۔ کیوں کہ پاکستان کے انداز میں محمود غزنوی کو بت شکن اور مساوات پسند اور مقدس سورما مانا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"محمود غزنوی، اشتیاق حسین قریشی یا ڈاکٹر صفدر محمود کی آزاد کا ہیرو نہیں ہے۔"(۱۰)

ان کے مطابق اورنگ زیب عالمگیر بھی پاکستانی نام نہاد بیانیوں کی طرح قصص ہند میں پیش نہیں کیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے مطابق اکبر ایک سیکولر ناپسندیدہ کردار ہے جب کہ اورنگ زیب ٹوپیاں اور کتابت کر کے گزارہ کرنے والا تھا مگر آزاد ایسا نہیں سمجھتے۔ اسی طرح محمد شاہ رنگیلا اور نادر شاہ افغانی کے حوالے سے بھی آزاد کا بیانیہ مختلف ہے۔ نسائی کرداروں نور جہاں، پدمنی اور دیول دیوی کے کردار بھی رومانی تشکیل سے پیچھا چھڑانے والے ہیں اور آزاد نے پہلی مرتبہ ان کرداروں کو عقل، ذہانت اور شجاعت و بہادری کے طور پر پیش کیا ہے۔ قاضی عابد لکھتے ہیں:

"قصص ہند اور تاریخ نویسی میں ایک ایسے متبادل بیانیے کا درجہ رکھتی ہے کہ اگر ہم تاریخیت اور نو تاریخیت کے تناظر میں اس کا مطالعہ کریں تو علم اور طاقت کی تال میل میں لکھی گئی ریاستی تاریخ کے کئی ساختہ بیانیوں کا انہدام ممکن ہے۔"(۱۱)

یہی ریاستی ہیرو ہمارے گلے کا ہار بنے ہوئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخ کچھ اور ہے اور ہمارے سامنے کچھ اور بنا کر پیش کی جا رہی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے لگتا ہے کہ ہماری تاریخ جھوٹ کا پلندہ ہے اور قاضی عابد کی اس بات کو سو فی صد سچ ماننے کو دل کرتا ہے۔ قاضی عابد یہ مضمون قومی طاقت اساس بیانیوں کی رد تشکیل کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس طرح نو تاریخیت کے حوالے سے خاصی اہم حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

۴) **خس و خاشاک زمانے: نو تاریخی پڑھت۔** یہ مضمون ڈاکٹر نسیم عباس احمر نے مستنصر حسین تارڑ کے شہرہ آفاق ناول "خس و خاشاک زمانے" کے بارے میں نو تاریخی تناظر میں لکھا ہے۔ یہ ناول بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کے تناظر میں گوجرانوالہ، پنجاب، لاہور، نیویارک، کنیڈا کے لینڈ سکیپ کو سامنے لاتا ہے۔ اس ناول میں مسلمانوں کی روایتی تاریخ (جو ہمارے مورخین بیان کرتے ہیں) کے مقابلے میں اصل تاریخ بیان کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نو آبادیاتی تصور کو یورپی اقوام کے حساب سے گردانتے ہیں مگر مسلمانوں نے نو آبادیات کا نقشہ پیش کیا۔ کیوں کہ وہ بھی دوسرے ملکوں سے آ کر یہاں حاکم بن گئے تھے۔ یہ بالکل ہی ہمارے روایتی ادبی تصورات سے الگ تصور ہے۔ اس کے علاوہ قائدِ اعظم نے بھی کھوٹے سکوں کو اپنے ارد گرد جمع کرنا شروع کیا تھا۔ جس طرح مسلم حکمرانوں میں یزید و شمر تھے۔ نسیم احمر لکھتے ہیں:

"انھوں نے ایک اور تاریخی تعبیر بھی کی ہے کہ برصغیر صرف انگریزوں کی حکمرانی کے دوران متحد کیا گیا تھا ۔ وگرنہ اس کے خمیر میں تو انتشار ہے۔ نئی مملکت کے قیام کے فوری بعد مفاد پرستوں کی قبضہ گری اور الائمنٹوں کا پول بھی کئی مقالات پر کھولا گیا ہے۔ کھوٹے سکوں کا انجام کار، پہلا مارشل لاء جنرل ایوب کی حکومت ٹھہرا۔"(۱۲)

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.04 No.01 (2026)

اس کے بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے بھی تارڑ نے ایک جگہ الگ بیانیہ بنایا ہے کہ تاریخ ایسی نہیں جیسی بنا کر ہمیں زبردستی پڑھائی جا رہی ہے۔ حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ملک پر ایک خاص مافیا مسلط ہے جو ہماری قسمت کے ساتھ کھلواڑ کر رہا ہے۔ مثلاً نسیم عباس احمر کہتے ہیں:

> "اس ناول میں جنرل نیازی کے دستخط کرنے کی کاروائی اور پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی ذلت کا بیان ملتا ہے۔ اس واقعے کے لیے سپاہی فتح محمد کی آپ بیتی سے مدد لی گئی ہے۔۔۔ کردار انعام اللہ کے ناول "آٹو بائیو گرافی آف اے باسٹرڈ" سے استفادہ کرتے ہوئے افغان مجاہدین کی روس جنگ میں شرکت، مجاہدین کی درندگی اور جہادیوں کی آپسی تفرقہ بازی کو شامل ناول کیا گیا ہے۔"(۱۳)

علاوہ ازیں اس ناول میں ۹/۱۱ کے تناظر میں عیاش جرنیلوں اور مافیا کے ہاتھوں ملک کی مزید بربادی اور ڈالری جنگ کے تناظر میں پورے ناول میں ہماری روایتی جھوٹی تاریخ کے مقابلے میں مستنصر حسین تارڑ نے ایک متوازن تاریخی اور تہذیبی بیانیہ بنایا ہے جس کو نسیم عباس احمر نے مختلف نو تاریخی حوالوں سے جانچا ہے اور یہ ایک اہم پیش رفت ہے کہ اب ہمارے فکشن ملک کی غیر مستند اور زبردستی ٹھونسی گئی تاریخی اصلیت کو سامنے لا رہے ہیں۔ یہی ایک دیانت دارانہ تجزیہ جو تاریخ کے کئی دروا کرے گا۔

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اوپر بیان کیے گئے فن پاروں کو نو تاریخیت کے بیانیے کی رو سے گزار کر ایک جدید تھیوری سے پرکھا گیا ہے جو یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ David Daichas, critical Approaches to word wroo .Longman London 1959,p:121

۲۔ ناصر عباس نیّر، عالم گیریت اور اردو اور دیگر مضامین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۲

۳۔ قاضہ افضال حسین، تحریر اساس تنقید، ایجوکیشنل بل ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳

۴۔ ناصر عباس نیّر، متن وسیاق اور تناظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۴

۵۔ محمد عمر فاروق، نظریہ نو تاریخیت اور اردو ادب میں نو تاریخیت کے نظری و اطلاقی مباحث کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ (غیر مطبوعہ مقالہ)، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۲۳ء، ص ۲۶۷

۶۔ شمس الرحمان فاروقی، متن کی جرأت، مرتب، قاضی افضال / صغیر ابراہیم، شعبہ اردو، علی گڑھ یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۷

۷۔ محمد عارف ایضاً، ص ۱۷۲۔۲۷۲

۸۔ پروفیسر احساس بیگ، گردش رنگ چمن، نئی تاریخیت کی ایک روشن مثال، (مضمون) مشمولہ، متن کی قرأت، ایضاً، ص ۱۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۱۰۔ ڈاکٹر قاضی عابد، اساطیر، کتھا، کہانی اور مابعد جدید تناظر، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۷۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۷۷

۱۲۔ ڈاکٹر نسیم عباس احمر، خس وخاشاک زمانے، نو تاریخی پڑھت، (مضمون) مشمول، نو تاریخیت، مرتبہ، نسیم عباس احمر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۰۵۔۲۰۸